اقبال جرم اور احساس اسیری

خطیب حق بیان مولانا سید سمیع الحسن وسیمؔ جائسی، دہلی

باسمہ سبحانہ

عزیزی اسیف میاں! السلام علیک!

آپ کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکوہ رہا کہ میں آپ کی میگزین کے لئے کبھی کچھ نہیں لکھتا۔ دراصل میں ٹھہرا ذاکر لہٰذا خوب جانتا ہوں کہ کہا ہوا فضاؤں میں تحلیل ہو جاتا ہے اور لکھا ہوا ہمیشہ کے لئے تحریر کی گرفت میں آجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کے آزاد زمانہ میں اسیری بھلا کسے پسند آتی ہے؟! انجام کار میں بھی کسی نہ کسی بہانے ڈال ڈال ہی رہا مگر نہ جانے کیوں آج میری بدبختی نے مجھے قلم اُٹھانے پر مجبور کر ہی دیا۔ اب آگے جو بھی ہو انجام......

بات اگر چہ چھوٹی سی ہے مگر بہت اہم ہے کہ کسی بھی قوم کی ترقی کا دار و مدار قوم کے پاس ''محفوظ سرمایہ'' کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اب یہ وقت کی ستم ظریفی ہے کہ اس سرمایہ کا میزان زر و جواہرات اور مالیات کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور اُس فکری سرمایہ تک کسی کی نظر ہی نہیں جاتی جو ذہنوں کو مالا مال کر دیتا ہے۔ کیا یہ ہماری قوم کی دگر گوں بدحالی کا مرثیہ نہیں ہے کہ ''سرمایۂ شبیری'' کو ہم ''میراث مسلمانی'' نہیں سمجھ رہے ہیں؟

بے انتہا کوفت ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ جس قوم کے پاس کربلا کا فکری سرمایہ ہو وہ بھلا کیونکر ذہنی افلاس کا شکار ہو۔ مگر کیا کریں ایسا ہو رہا ہے۔ مرض کی تشخیص ہو گئی علاج مرض بھی چاہئے۔ علاج ہے منبروں کا تعمیری استعمال جن کے ذریعہ کربلا کی روشنی میں ذہنوں کو ڈھالنے کی سعی کی جائے۔ ایام عزا کو روایتی انداز میں محض ''وارشک پرو'' نہ سمجھا جائے بلکہ اس کے اصولوں کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں اُتارنے کی کوشش کی جائے۔

صرف عشرہ اول کے دس دن اگر ذاکرین و خطباء پوری ایمانداری سے اس مقصد میں دل و جان سے جٹ جائیں تو قوم کی آئندہ تصویر کچھ سے کچھ ہو سکتی ہے کیونکہ معرفت کا اک لمحہ عمر جاودانی ہوتا ہے۔ زیر نظر طنزیہ ''اقبال جرم'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے کیوں کہ خیال خاطرِ احباب چاہئے ہر دم۔

خیر اندیش

سید سمیع الحسن وسیمؔ جائسی

''اقبال جرم''

'میں' برگد کے پرانے پیڑ پر بیٹھا ہوا اک بوڑھا گدھ ہوں۔ جس کی گول گول آنکھیں ہمیشہ ہی شکار کی تلاش میں رہتی ہیں۔ شکار کے خیال سے ہی میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگتی ہے اس کی ہر آہٹ میری آنکھوں کے گلابی ڈوروں میں اضافہ کر دیتی ہے۔ میرے بال و پر خود بہ خود پھڑ پھڑانے لگتے ہیں اور میری پیلی چونچ شکار کے رگ و ریشہ کو اُدھیڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ **(بقیہ صفحہ ۵۲ پر)**

حرؑ نے یہ سن کے سرور خادم نواز سے
سر پائے شاہ دیں پہ جھکایا نیاز سے
کی عرض رو کے سبط رسولؐ حجاز سے
ہے آگہی حضور کو ہر دل کے راز سے

بے آب سب تڑپتے ہوں بچے جناب کے
کمہلاتے ہیں نہال رسالت مآبؐ کے
اٹھتے ہیں اب خیام سے شور اضطراب کے
کھٹکے حقیر کو بھی ہیں یوم حساب کے

یارا نہیں کہ دیکھوں مصیبت امامؑ کی
اس بیکسی پہ جان فدا ہو غلام کی

اولادِ مرتضٰی کی گذر جائے، میں جیوں؟
آلِ رسولؐ پیاس سے مرجائے میں جیوں؟

بقیہ............اقبال جرم اور احساس اسیری

آج شکار کا انتظار طویل ہوتا جا رہا ہے۔ بھوک پیٹ میں قیامتیں اُٹھا رہی ہے جی بگڑ رہا ہے نہ جانے قدرت کو کیا منظور ہے۔ اچانک 'میں' نے محسوس کیا کہ میری جسم وجاں میں حیرت انگیز تبدیلی ہورہی ہے۔ بال و پر ناپید ہوتے جا رہے ہیں اور چونچ سمٹتی جارہی ہے۔ ایک دم ایسا ہوا کہ میرا سراپہ ایک انسانی قالب میں ڈھل گیا۔

عریانیات کسے بھلی لگتی ہے لہٰذا میں نے بھی جسم کو ڈھانپنے کی سعی کی۔ چوڑا پائجامہ، لمبا کرتا، اچکن اور سر پر ٹوپی مجھے اپنی فطرت کے مطابق لگے سو میں نے پہن لئے۔ درخت سے اتر کر میں انسانوں کے معاشرہ میں مٹر گشتی کرنے لگا مگر بلندی پر رہنے کا خیال بار بار مجھے منقلب کر رہا تھا۔ انسانوں کے ہجوم کے درمیان مجھے ایک قدرے بلند جگہ دکھائی دی اور 'میں' ایک ہی جست میں وہاں جا بیٹھا۔ 'میں' نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی اور محسوس کیا کہ میری پہلی چونچ میں بھی شاید وہ دھار نہیں تھی جو اب میری زبان میں ہے۔

وہ دن اور آج کا دن میں لگاتار اسی بلند مقام پر بیٹھا ہوا ہوں اور شکار پہ شکار کر رہا ہوں۔ میری چونچ کی کھرونچیں محراب مسجد پر اور مقدس علماء کے عماموں پر آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں مگر شائد کوئی دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔ واہ واہ کی صداؤں نے شاید لوگوں کو موقع ہی نہیں دیا کہ وہ سمجھ سکیں کہ 'میں' برگد کے پُرانے درخت پر بیٹھا ہوا وہی 'بوڑھا گدھ' ہوں جس کی گول گول آنکھیں ہمیشہ ہی شکار کی تلاش میں رہتی ہیں۔

"احساسِ اسیری"

اک خلش، اک چبھن
دل کو کئے ہے بے چین
میں تڑپتا ہی رہا
نرم ہواؤں کے لئے
کھڑکیاں کھول دو
کمرے کی اندھیرا ہے بہت
کھڑکیاں کھولنا ممکن نہیں
تو اہلِ صفا
توڑ ڈالو در و دیوار
تردّد کیا ہے
جان لوحق کے تعارف کے لئے
اک سویرہ ہے، بہت ایک سویرہ ہے بہت

